DATE LABEL

483

۷۸۶

اسوۂ حسنہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ
بیشک انسانی برادری کے لئے رسول خدا کی
ذات بہترین نمونہ ہے

سیرت خاتم الانبیاء پر ایک بصیرت افروز مقالہ

اسوۂ حسنہ

رشحہ قلم

عالیجناب مولانا مولوی شبیہ الحسنین صاحب دامت برکاتہٗ

حسب فرمائش

جناب حکیم ڈاکٹر سید عنایت علی شاہ صاحب نقوی

اپریل ۱۹۳۷ء

قیمت ۸/

اعتذار

پیش نگاہ مضمون رسالہ "البرہان" میں شائع ہو چکا ہے۔ بظاہر تجدید اشاعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر بعض احباب خصوصاً جناب حکیم ڈاکٹر سید عنایت علی صاحب کے اصرار سے عاجز آکر تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ نذر ناظرین کر رہا ہوں۔ امتثال فرمائش کے ساتھ افادہ کی عمومیت بھی پیش نظر ہے اس لئے کہ عموماً ماہانہ رسالے خاص خاص حضرات کی نظر سے گذرتے ہیں۔ عام افراد محروم مطالعہ رہتے ہیں۔

سیرت خاتم الانبیاء جیسا وسیع موضوع ایک بسیط تبصرہ چاہتا تھا۔ مگر بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے مزید قلم اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ انشاء اللہ پھر کبھی اس بحر بیکراں میں غواصی کا شرف حاصل کرونگا۔ فی الحال اہل عقل و فہم کے لئے اس چھوٹے سے مضمون میں بھی بہت کچھ سامان بصیرت ملیگا۔

شبیہ الحسنین

(۷۸۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ العلیم الحکیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم
الرحیم وآلہ العظیم الفخیم

ارباب عقل و فہم کا اتفاق ہے کہ انسان شکم مادر سے کچھ لیکر نہیں آتا۔ دماغ کی فضا بالکل محدود ہوتی ہے۔ آنکھیں بے نگاہ۔ زبان گنگ۔ کان بہرے۔ ہاتھ پیر بے کار اچھے برے میں تمیز نہیں ہوتی۔ اپنے پرائے میں امتیاز نہیں ہوتا۔ چشم نیم وا کبھی ضرور ہے۔ لیکن بہن بھائی۔ ماں باپ۔ عورت مرد کی شناخت اور پہچان سے خالی۔ کان سنتے بیشک ہیں مگر مختلف آوازوں کو صوت واحد کی صورت میں دست و پا بھی حرکت کرتے ہیں آس پاس کی اشیاء کو مس بھی کرتے ہیں مگر احساس سختی او نرمی سے عاری۔ غرضیکہ دور حیات کی ابتدائی گھڑیاں انسانی کمزوری جہالت و لاعلمی کی آئینہ دار۔ بچہ کچھ نہیں جانتا کچھ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ فطرت نے قدرت نے اس کو تعلیم دے کے پڑھا لکھا کے نہیں بھیجا۔ ابھی وہ لاعلم محض ہے ہاں فطرت کے فیاض ہاتھوں نے اس کے وجود میں حصول علم کے ضروری ضروری آلات ودیعت فرما دئے ہیں۔ جہالت کے پتلے اور لاعلمی کے پیکر کو تحصیل علم کی استعداد عنایت فرمادی ہے۔ "واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئا فجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لا۔" "تم کو علیم و حکیم خالق نے شکم مادر کی تاریکیوں سے عالم وجود کے نورانی آغوش میں ایسی حالت میں بھیجا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس کارساز علیم نے تمہاری جہالت کے پردے

کو چاک کرنے کے لئے کان بنا دیئے۔ آنکھیں عنایت فرما دیں۔ دل پیدا کر دیا
تاکہ کانوں سے سازِ قدرت سے نکلنے والے مسرت کن نغمات کو سنو۔ آنکھوں سے
حسینانِ فطرت کے جلووں کو ملاحظہ کرو۔ اور دل سے اچھی بری بات کا فیصلہ
کرو۔ کہ کہیں کان صوتِ ابلیس کو نوائے الٰہی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ آنکھیں
ظلمانی پیکروں کو ہیاکل نورانی تو محسوس نہیں کر رہی ہیں۔ درست و غلط کا فیصلہ
قلب دل کے اختیار میں دیا گیا۔ مذکورہ آیت صاف اشارہ کر رہی ہے۔ کہ
انسان ابتدائے آفرینش میں جاہل اور لاعلم ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ماحول کے
اثرات سے متاثر ہوتا ہوا ارتقائے علمی کے زینوں کو طے کرتا ہے۔ وہ ماں کے
پیٹ سے پیدا ہو کر گونگے بہرے اندھے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔
فضائے کائنات کی کثیف ہوا قدرت کے حکم کے ماتحت حواس خمسہ ظاہریہ کو
علم و عمل کر سکنے کے لائق بناتی ہے۔ اس لئے عطائے حواس و قویٰ کا راز یہی
ہے کہ وہ عالمِ مادیات و عقلیات کا مطالعہ کر کے اپنے معلومات کے تنگ دائرے
کو وسیع بلکہ وسیع تر بنا دے۔ ذوقِ تجسس کی آگ جو فطرتاً ہر انسان کے
دل میں روشن ہے۔ وہ اسی لئے ہے کہ جو چیزیں وجودِ انسانی سے خارج
اور غیر معلوم ہیں۔ ان کو اپنی کوشش و کاوش سے معلوم کر کے اپنے وجود کا
جزو بنا لے۔ بہر صورت یہ امر اپنے مقام پر مبرہن ہے کہ انسان کا علم خارجی ہوتا
ہے۔ داخلی نہیں ہوتا۔ بچہ پڑھا لکھا ہوا پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کا معتدبہ حصہ
گذار کر پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہے۔ وہ صنعت و حرفت کا عالم نہیں ہوتا۔ بلکہ
طبیعت کا لگاؤ دیکھ کر ماں باپ کسی خاص پیشہ کا اشارہ کر لیتے ہیں۔ وہ

اُسی کو اختیار کر لیتا ہے۔ اب آگے اُسے کوشش کے دریا میں ہاتھ پیر مارنے نہیں آتے۔ بحرِ تفکرات میں غوطے کھانا نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ بعد کی باتیں ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں حاصل کرتا ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ یہ جو کچھ ایک بچہ کرتا ہے۔ وہ دوسرے کو دیکھ کر کرتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا ذرا سا بھی علم حاصل نہیں اسے بغیر دیکھے کیونکر انجام دے۔ یہ تو اچھی خاصی تکلیف مالا یطاق ہے اسی لئے انسان اپنی زندگی کے تمام اجزا میں کسی نہ کسی نمونہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر نمونہ سامنے نہ ہو۔ تو اس کی پوشیدہ قوتیں جو فطرت نے اس کو عنایت فرمائیں ہیں کبھی فعلیت اور ظہور کا جامہ نہیں پہن سکتیں۔ اب یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ ایک نمونہ تمام معاملات اور ضروریات میں کامل ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اختلاف ضروریات کے ساتھ نمونہ بھی مختلف ہو جاتا ہے ایک بچہ کے واسطے سب سے پہلے اس کی ماں نمونہ کی حیثیت سے اس کے سامنے آتی ہے۔ ماں جو کام کرتی ہے۔ بچہ وہی کام کرنے لگتا ہے اتحادِ حقیقت انسانیت کے باوجود زبان۔ تمدن لباس وضع قطع کا اختلاف نمونہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ماہیت واحدہ مثلاً آگ کو ایک اردو داں آگ اور انگریز فائر۔ عرب نار۔ ایرانی آتش کہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں شے ایک ہے مگر چونکہ اس حار بالطبع شے کا نام مختلف زبانوں سے بچہ نے الگ الگ سُنا اس لئے ایک مفہوم اور شے کے لئے متعدد لفظ جمع ہو گئے۔ بہرصورت چونکہ ماں اپنے دلبند کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ لہٰذا جو صفات اور اخلاقیات ماں کے

ہوتے ہیں وہ بچہ کی رگ و پے میں لہو کی طرح دوڑ جاتے ہیں۔ عالم طفلی میں جو نقش لوح قلب پر ابھر آتا ہے۔ وہ مٹائے نہیں مٹتا۔ بچہ اپنے ابتدائی عادات میں ہو بہو ماں کی تصویر ہوتا ہے۔ ہم دو تین برس کا بچہ دیکھ کر اس کے لباس وغیرہ پر سرسری نظر ڈال کر باسانی اس کی ماں کے اچھے اور برے خصائل کا پتہ لگا لیتے ہیں اس لئے کہ ماں جیسی لائق اور سلیقہ مند ہوگی۔ بچہ بھی اتنا ہی مہذب اور زیور آداب سے آراستہ۔ اور ماں جیسی نالائق اور پھوہڑ ہوگی۔ بچہ اتنا ہی ناکارہ اور ہٹی ضدی یہی وجہ ہے کہ تہذیب یافتہ ماں کے آغوش تربیت کا پلا ہوا بچہ اکثر و بیشتر اعلیٰ تہذیب کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور کندۂ ناتراشیدہ جاہل عورت کا پوت جہالت کے آغوش میں کروٹیں بدلا کرتا ہے۔ ماں کے بعد بچہ کا باپ نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے اور باغ دل کا یہ نونہال باپ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر مشہور مثل ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ باپ کے بعد کنبہ خاندان والے۔ محلہ والے۔ شہر والے۔ ملک والے۔ یہاں تک کہ دنیا جہان کے ساکن ضروریات انسانی کی ترقی کے ساتھ نمونہ ہوتے جاتے ہیں۔ جو حال ملک و قوم کا ہوتا ہے۔ وہی اس کے فرد قوم کا بھی ہو جاتا ہے۔ اب تک کی گفتگو تو زیادہ تر تمدنیات اور مادیات سے متعلق تھی۔ ہم مذہبیات و روحانیات میں اور بھی زیادہ نمونہ کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ مذہبی یا روحانی مسافر بغیر کسی دستگیر کے ایک گام راہ طے نہیں کر سکتا فانوس دماغ میں جلنے والی شمع اس کے واسطے بجائے نورانیت کے ظلمت کا اضافہ کرتی ہے اگر کوئی رہبر ساتھ نہ ہو۔ تو اس کو کیا معلوم کہ معبود کل رب العالمین کی مرضی

کس فعل میں ہے اور کس امر میں ناراضی کا خدشہ استحسان و قباحت افعال و اعمال کا علم اس کو قدرت کی طرف سے بغیر کسی خارجی طاقت کی امداد کے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے انسان فطرتاً اپنی مذہبی زندگی کے لئے ایک نمونہ تلاش کرتا ہے۔ تاکہ اس کے نقشِ قدم پر قدم رکھتا ہوا مالکِ کائنات کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرے وہ بلوغتِ عقل کے بعد اپنے گرد و پیش نظر ڈالتا ہے اور ماحول سے متاثر ہو کر ان نمونوں کو اپنا سچا رہبر تسلیم کر لیتا ہے جو اس کے خاندان قوم اور شہر و ملک میں قابلِ احترام تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اختلاف مذہب کی وجہ یہی ہے کہ ماحول کا اثر غور نہیں کرنے دیتا۔ حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ بچپن میں دیکھی سمجھی باتیں واقع کا لباس اختیار کر لیتی ہیں۔ ورنہ اگر انسان اپنی نظر کو وسعت دے اور تنگ نگاہی سے کام نہ لے تو نقطۂ اتحاد تک پہنچ جانا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ایک سیدھی راہ پا کر درست مذہب سے ہمکنار ہو کر ابدی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ معمولی سا تفکر اسے بتا دیگا کہ عالم میں ہزاروں نمونے ہیں جن میں سے ہر ایک کمال کا مدعی۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب کامل ہوں بلکہ کامل تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے باقی کل ناقص پس اس کامل کی جستجو کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ خطوط میں خطِ مستقیم صرف ایک ہو سکتا ہے۔ باقی سب منحنی اور ٹیڑھے۔ اسی طرح کامل اور اکمل نمونہ بھی صرف واحد ہو سکتا ہے۔ دو نہیں ہو سکتے۔ کجا کہ سو دو سو اور ہزار دو ہزار۔

اس نمونہ کی ضرورت کو عالم امکان کے ہر مذہب کے افراد نے تسلیم کیا ہے۔ مذہبی آدمی اس کی ضرورت کے مقر ہیں لیکن باوجود اس کے ان کے مذہب کی وہ کتابیں جن پر بنیادِ دین قائم ہے۔ نمونہ کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کی بجائے

خاموش اور ساکت ہیں۔ جس مذہبی کتاب کو جی چاہے دیکھئے نمونہ کی ضرورت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ حالانکہ راہ بقا کا مسافر نمونہ کا بہت زیادہ محتاج ہے۔ ہم ریلوے کے تمام حالات سے واقف ہیں۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات مقرر ہیں۔ لیکن پھر بھی اسٹیشن پہنچ کر ایک رہبر تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ بتلائے کہ کس پلیٹ فارم سے گاڑی چھوٹتی ہے۔ پھر پلیٹ فارم پر بھی پہنچ کر اطمینان نہیں ہوتا بیٹھے ہوئے مسافروں سے تسلی کے لئے استفسار کرتے ہیں اور ٹکٹ چیکر سے دریافت کرتے ہیں پھر بھی جب تک مطلوبہ شہر نہیں پہنچ جاتے۔ پریشانی دور نہیں ہوتی۔ اب فرض کر لیجیے کہ کوئی صاحب دہلی کا ارادہ کرکے لدھیانہ اسٹیشن پر جائیں اور بغیر کسی کے پوچھے گچھے جو ٹرین سامنے ہو جھٹ سوار ہو جائیں۔ اتفاقاً وہ گاڑی لاہور جا رہی ہو۔ تو مسافر صاحب کا کیا حال ہوگا۔ وہ بجائے دہلی کے لاہور جا پڑیں گے۔ ٹکٹ ضائع ہوگا اور دھکے کھانے پھرینگے سو الگ۔ اب ذرا سفر آخرت کو ملاحظہ فرمائیے۔ کوئی صاحب بغیر کسی کے پوچھے گچھے خود ساختہ عبادت فرمائیں۔ خود کوئی نبی امام چن لیں اپنے خیال سے تو راستہ درست ہی اختیار کیا ہے مگر ان کو کیا پتہ کہ یہ راہ دوزخ تک ہے ع

"کیں راہ کہ میروی بترکستان است"

احتیاج رہبر کے باوجود کتب مقدسہ کی نمونہ کے بتلانے سے خاموشی بتلاتی ہے کہ ان کتابوں کے لانیوالے کل عوالم کے لئے نمونہ بن کر نہیں آئے تھے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ کسی طرح کا ذکر نہ ہوتا۔ اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔ تو قرآن نے۔ اور یہ ایک کامل کتاب کی شان ہے کہ ضروریات انسانی میں سے کوئی ضرورت رہنے نہ پائے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"۔

بیشک تم لوگوں کے لئے رسول کی ذات ایک بہترین نمونہ ہے۔

یوں تو خالق عالم کی طرف سے جو لوگ بھی ہدایت کے لئے آئے وہ سب کے سب نمونہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی تعلیمات ضرور قابل عمل تھیں۔ ہاں سرور کونین اور دیگر معلمین میں بس فرق اتنا ہے کہ دیگر ریفارمر تو کسی خاص قوم اور ملک کے لئے مبعوث ہو کر نمونہ بنے تھے۔ مگر سب کے بعد آنیوالا نبی جو خاتم الانبیاء بن کر آیا تھا جس کے بعد کسی نمونہ کی دنیا والوں کو ضرورت نہیں۔ ما ارسلناک الا کافتہ للناس وما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ ہم نے تم کو تمام افراد انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور چونکہ تم تمام کائنات کے لئے یکساں نمونہ ہو۔ اس لئے تم خاتم الانبیاء بھی ہو اب کسی اور نبی کے آنے کی ضرورت نہیں۔ آخر جب رسول اسلام کامل تھا تو پھر کسی ناقص کی ضرورت کیا ہے۔

مکہ کی سنگلاخ سرزمین میں پیدا ہونے والا نبی ذرہ ذرہ کائنات کے لئے نمونہ ہے۔ گو وہ پیدا ہوا عرب میں لیکن اسے کسی سرزمین سے خصوصیت نہیں۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ میں تم سب کی طرف بلا تخصیص رسول الٰہی ہوں۔ بعثت الی الاسود والاحمر۔ میں ہر گورے کالے کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ رسول مدنی کو کسی ملک اور قوم سے خصوصیت نہیں۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا۔ برتر ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرما کر تمام عوالم کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل کچھ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے افراد بھی اس کے دعوے دار نظر

آتے ہیں کہ اُن کا تسلیم کردہ نمونہ عالم امکان کے ہر گوشہ کے واسطے واحد نمونہ ہے
لیکن اُن کی کتابیں اس دعوٰی پر کوئی برہان یا دلیل قائم نہیں کرتیں آریہ صاحبان
اب کچھ دنوں سے وید کو سب سے زیادہ قدیم کتاب اور اُن کے لانے والے
رشیوں کو سب سے پہلا اور کامل معلم بتلاتے ہیں مگر وید اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں
کرتی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ سوامی دیانند جی سے پہلے وید کی تعلیم عام نہ کی جاتی اور
اس کی آواز کو معلومہ دنیا کے آخری کناروں تک نہ پہنچا دیا جاتا۔ برخلاف اس کے
یہ ثابت شدہ بات ہے کہ ساری دنیا تو رہی درکنار۔ خود بھارت ماتا کے اکثر فرزند وید
کی تلاوت اور اس کے احکام پر عمل نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہاں تک کہ اُس کا
دیکھنا بھی جرم تھا۔ سوائے برہمنوں کے ہندوستان کے دوسرے باشندے
وید کی تعلیم حاصل کرنے کے حقدار نہ تھے۔ اگر شودر طبقہ کے کسی فرد کا سایہ بھی وید پر
پڑ جاتا تھا۔ تو وہ قابل قتل۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن پر اب سے تقریباً پچاس برس
پہلے تک عملدرآمد ہوتا رہا۔ حق تو یہ ہے کہ سوامی دیانند نے اسلامی تعلیمات اور
اسلامی کتاب سے متاثر ہو کر یہ دعوٰی کیا کہ ویدک دھرم اور اس کے لانے والے
تمام عالم کے لئے نمونہ ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے کے آریہ ریفارمرس کی تحریروں
میں شہر خموشاں نظر آتا ہے۔ ہم نہایت فراخ حوصلگی سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم کو
سوامی جی کی بات ماننے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ اگر وید کے ساتھ ساتھ معلمان وید
کے حالات تاریخ کی روشنی میں نظر آتے۔ پھر ہمیں موقع تھا کہ ہم اُن کے علم و عمل
کا جائزہ لیکر اپنے لئے نجات کا راستہ مُعین کر لیتے۔ مگر ہم کو تو یہ بھی پتہ نہیں
کہ رشیان وید تھے کون۔ کس شہر میں تشریف لائے۔ اپنے فرض کو کس حد

تک انجام دیا۔ اور کب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی زندگی کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ آریہ آج تک ان کی ہسٹری کو منظرِ عام پر پیش کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر بتلایئے۔ جب تک ہم معلّمین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کی عملی جد وجہد کا نظارہ نہ کر لیں۔ اُن کی پیروی کیونکر کر سکتے ہیں۔ یہ مانا کہ اُن کی تعلیم بہت اچھی تھی۔ اور جس قوم جس خطے میں اس کو رواج دیا گیا۔ وہاں قابلِ عمل بھی تھی۔ مگر آفت تو یہی ہے کہ آجکل زمانہ بہت کچھ ترقی کر چکا ہے۔ دس ہزار برس پہلے کے تمدّن اور آجکل کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ضروریات کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔ اب وہ تعلیم ہماری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی پھر محض علم رہبری کی منزل میں کام نہیں دے سکتا۔ ہر منزل میں تعلیم کے ساتھ عمل کر کے دکھانے کی ضرورت ہے۔ وید ناقص تعلیم کو تو ضرور پیش کر سکتا ہے مگر تعلیم کا جزو لاینفک عمل کہاں سے لائیگا۔ کیونکہ اوّل تو رشیان وید نے سوائے تپسیا کرنے اور انسانی قوّت کو بیکار بنانے کے اور کچھ کیا ہی نہیں اور اگر کچھ کیا بھی ہوگا۔ تو وہ انقلاب زمانہ کی نذر ہو چکا۔ بے سود ہے وہ تعلیم جو عمل سے خالی ہو جس کے ساتھ عملی نمونہ پیش نہ ہو۔ برخلاف اس کے تم قرآن کو اوّل سے آخر تک دیکھ جاؤ۔ جو کچھ اس میں مسطور ہے۔ وہ سب کچھ معلّم قرآن نے کر کے دکھا دیا۔ سرکارِ دوعالم کی تاریخ پیدائش سے لیکر وفات کے دن تک جزو کل حالات تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے سے تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآنی الفاظ کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ رسولِ اسلام نے صرف تعلیم ہی نہیں دی جو نا قابلِ تسلیم ہو۔ بلکہ ہر تعلیم کو عمل کے ساتھ پیش کیا۔ جو کچھ قرآن نے کہا۔ وہ

کر کے دکھا دیا۔ اور اس کمال کے ساتھ کہ ہم قرآن کو رسولِ اسلام کی ہسٹری اور لائف کہہ سکتے ہیں۔

ہم کو یہ تسلیم کر لینے میں بھی عذر نہیں ہے کہ سری رامچندر۔ کرشن جی مہاراج اور حضرت عیسٰی وغیرہ اپنے اپنے وقت میں قابلِ اتباع نمونہ کی حیثیت رکھتے تھے اور آج بھی وہ بعض بعض باتوں میں انسانی برادری کے سامنے نمونے کی حیثیت سے آسکتے ہیں لیکن ان حضرات میں سے ایسا کامل اور اکمل نمونہ جو ضروریاتِ زندگی کے ہر شعبہ میں نقشِ راہ بن سکے کوئی بھی نہیں۔ یہ تو رسولِ اسلام ہی کے خصوصیاتِ خاصہ میں سے ہے جس میں اُن کا دوسرا شریک نہیں۔ اب آپ دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے حالات پر نظر ڈالیں پھر اس کے بعد رسولِ اسلام کی ہسٹری ملاحظہ کریں تو کمال صرف اسی مبارک ذات کو حاصل ہے۔ بیشک اطاعتِ والدین انسانی اخلاقیات کا ایک بہترین جوہر ہے جو وجودِ انسان کے تاج کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ بیشک اس منزل میں جناب رام چندر ہمارے لئے نیک نمونہ بن سکتے ہیں کہ انہوں نے باپ کی بات رکھنے کے لئے ملک و مال پر ٹھوکر مار دی اور چودہ برس کا بن باس قبول کر لیا۔ مگر اس صفتِ حسن کے بعد سری رام چندر جی کی تاریخ میں سناٹا نظر آتا ہے ہم کو کوئی اور صفت اُن کے اخلاقیات میں نہیں ملتی۔ جس کو ہم نمونے کے طور پر سمجھ سکیں۔ آخر سخاوت۔ کرم۔ شجاعت۔ عدالت وغیرہ دوسرے اخلاقی جوہر بھی تو ہیں۔ اس میں جناب رام قابل اتباع نظر نہیں آتے۔ ان صفات کو حاصل کرنے کے واسطے کسی دوسرے کے دامن کا تمسک ضروری ہے۔ اب آؤ شجاعت کی منزل میں صرف کرشن جی مہاراج کو نمونہ سمجھو۔ کیونکہ انہوں نے اپنی قوم کی آزادی کے لئے

ستعدورا جاؤں ۔ بہار اجاؤں اور اُن کی رعایا کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ مگر یاد رکھو
کہ کرشن جی کے افسانہ شجاعت کے بعد کرشن جی کی اخلاقی دُنیا میں کچھ بھی نہ ملیگا۔
حلم تو اُن کے پاس پھٹکا بھی نہیں ۔ بردباری سے وہ آشنا بھی نہیں انہیں قتل و غارت
کے ساتھ رحم کی عادت نہیں ۔ اب حلم و بردباری میں جناب عیسیٰؑ کو نمونہ بنا لیا جائے
کیونکہ مقام حلم میں اُن کی تعلیم بہت اچھی تعلیم ہے ۔ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ
مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے ۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا
لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے پہننے دے ۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے
جائے ۔ اس کے ساتھ دو کوس چلا جا (انجیل متی باب ۵ آیت از ۳۹ تا ۴۲)
بادی النظر میں کیسی پیاری تعلیم ہے لیکن جوہر شجاعت کو فنا کر دینے والی ہے ہاں
اگر اس کے ساتھ ساتھ موقع و محل کو بھی بتا دیا جاتا۔ تو کچھ نہ کچھ لائق عمل ہو جاتی ۔
لیکن ابہام محل کی وجہ سے خود عیسائی بھی جناب عیسیٰؑ کو نمونہ بنانے سے قاصر
ہیں ۔ بھلا گریٹ وار کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ عیسائی حضرات جناب عیسیٰؑ کی
تعلیم پر عمل پیرا ہوتے ہیں ۔ اور اصل بات یہ ہے کہ عیسائی لوگوں کا جناب عیسیٰؑ
کی تعلیم پر کاربند نہ ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے کیونکہ جب تعلیم ہی ناکارہ ہو
عمل کرنے کے لائق نہ ہو ۔ تو اس میں عیسائی و غیر عیسائی کر ہی کیا سکتے ہیں کیونکہ
فطرت انسانی مقتضی جنگ و جدال ہے ۔ بلکہ جنگ جزو فطرت انسانی ہے ۔ الناس
مفطورون علی المطامع و دیہم التخاصم والتنازع ۔ انسانی فطرت میں طمع اور
لالچ داخل ہے اور اُن کی عادت جھگڑے اور لڑائی کی مقتضی ۔ جب دو چار آدمی
مل کر بیٹھتے ہیں مطمح نظر کا اختلاف جنگ کا سبب ہو جاتا ہے ۔ ایک ہی شے

کہ ایک گروہ پسند کرتا ہے دوسرا ناپسند۔ ایک شے بعض کو مرغوب ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کو نامرغوب۔ ایک کی دولت دوسرے کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ وہ اُس کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔ پھر دوسرا بھی انسان ہے اس کو بھی اپنے مال و دولت کی حفاظت ضروری ہے۔ لہٰذا جلب منافع اور دفع مضار جنگ و جدال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انسانی حرص و آز مشہور ہے ؎

آن شنیدستی کہ در صحرائے گور — بار سالاری بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور

ہاں اس موقع کے لئے قرآن جو تعلیم اہل عالم کے سامنے پیش کر رہا ہے وہ اصول فطرت کے بالکل مطابق ہے اور دنیا اس پر عمل پیرا ہو سکتی ہے وہ کہتا ہے :۔ جزاء سیئۃ سیئۃ بمثلہا فمن عفی و اصلح فان اللہ غفور الرحیم۔ "بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے لیکن جو معاف کر دے یا صلح کر لے تو خداوند عالم بخشنے والا مہربان ہے۔" آیت کا مطلب یہ ہے کہ امن عامہ میں خلل نہ پڑے۔ اگر شریر کی رسی دراز کر دی گئی تو پھر آتش فساد کا بجھنا مشکل ہوگا۔ اس لئے جیسے کو تیسے کا حساب ہونا چاہئے لیکن اگر یہ امن معاف کرنے سے باقی رہ سکتا اور اصلاح اشرار ہو سکتی ہو۔ تو عفو کرنا ہی بہتر ہوگا۔

شخصی ضروریات تو کچھ نہ کچھ جنگ سے بچانے کا سامان مہیا کر سکتی ہیں لیکن قومیت و سلطنت کا سوال فوج رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ جنگ کا خطرہ سرحدوں کی حفاظت کراتا ہے۔ دشمن کے حملہ کرنے کا خوف ہر وقت لگا رہتا ہے

ایسی حالت میں کوئی عیسائی ہم کو بتائے کہ جناب عیسیٰؑ کی مبہم تعلیم بردباری کیونکر کارآمد ہوسکتی ہے۔ ایک طمانچہ کھا کر دوسرا رخسارہ ہر جگہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر کوئی عیسائی جرأت کرکے جناب عیسیٰؑ کی تاریخ سے کچھ تلواریں خریدنے کا واقعہ پیش کرے تو شاید چند جاہل اور سادہ لوح لوگ دھوکے میں آجائیں کہ جناب عیسیٰؑ کی تعلیم میں اصول جنگ کی تعلیم بھی داخل ہے۔ لیکن تعلیم کے ساتھ عملی نمونہ طلب کیے جانے کے واسطے اعتراض کا راستہ صاف ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ صرف تلواروں کا خریدنا اصول سپاہگری نہیں سکھا سکتا۔ یہاں تو پریکٹیکل تعلیم کی ضرورت ہے۔ اصول حرب کا معلم تو وہی انسان ہوسکتا ہے جس نے دوچار معرکے جھیلے ہوں اور میدان جنگ میں اپنی فوج کی خود ہی کمان کی ہو۔ جناب عیسیٰؑ کی تاریخ دیکھ جاؤ۔ وہ کبھی میدان جنگ میں ایک جرنیل کی حیثیت سے اپنے فرض کو ادا کرتے ہوئے نہیں مل سکتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جنگجو اور بہادر قوم طالب نمونہ ہو۔ تو جناب عیسیٰؑ کو کیونکر پیش کیا جائے۔ ہاں جوہر شجاعت کا سچا نمونہ۔ اصولِ جنگ کا بہترین معلم تلاش کرنا چاہتے ہو۔ تو آؤ تم کو احد کے میدان میں خندق کے کارزار میں۔ بدر کی رزم میں عالم امکان کا کامل و واحد نمونہ اپنی چھوٹی سی فوج کی بے مثل کمان کرتا ہوا ملیگا۔ اور ایسی بے نظیر کمان کہ مسلمانوں نے میدانِ احد میں ذراسی خلاف ورزی کی تھی۔ جنگ کا نقشہ الٹ گیا۔ فتح شکست کے قالب میں ڈھل گئی۔ بڑھتے ہوئے مسلمان پسپا ہوگئے۔ بھاگتے ہوئے کافر امنڈ آئے۔ اگر علیؑ نہ ہوتے شبیر خدا کی تلوار نصرت اسلام نہ کرتی تو چراغ اسلام گل تھا۔ شمع توحید بجھ کے رہ جاتی۔ ہیں جناب روح اللہ کی زندگی میں جنگ کا کوئی عملی نمونہ نہ دیکھنے کے باوجود بھی مستقبل

زندگی سنوارنے کے واسطے ان کو اسوۂ حسنہ تصور کر لیتا۔ لیکن عیسائی آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ آج وہ جس ہستی کو اس کے حدود تبلیغ و ہدایت سے بڑھکر دائرہ کائنات کے لئے نمونہ سنوانے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں وہ کسی وقت بھی تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نمونہ نہیں ہو سکتی۔ عالم امکان تو بڑی چیز ہے۔ خود عیسائی دنیا کے لئے جناب عیسیٰؑ کچھ اچھا نمونہ قرار نہیں پا سکتے۔ اور اگر عیسائی دنیا ان کی تعلیم پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہو کر ہمت چست کر ہی لے تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دس بیس سال کے محدود عرصے میں ساری عیسائی آبادی برباد ہو جائیگی۔ شہروں میں تو کوئی باقی نہیں رہ سکتا۔ قبرستان ضرور آباد ہو سکتا ہے اس لئے کہ جناب عیسیٰؑ نے کسی وقت میں بھی ازدواجی زندگی بسر نہیں کی انہوں نے صنفِ نازک کی کسی فرد کو اپنا شریک زندگی بنانا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ساری زندگی تجرد میں بسر کر دی۔ اب عیسائی ان کو نمونہ قرار دے کر دنیا شادی کرنا چھوڑ دیں پھر تماشہ دیکھیں۔ ذرا غور کرنا چاہیئے۔ سوچنا چاہیئے کہ مجرد انسان صاحبان اہل و عیال کے لئے کیونکر نمونہ ہو سکتا ہے۔ جناب عیسیٰؑ نے کس وقت شادی کی کون سی اولاد چھوڑی۔ بیوی کے ساتھ کیا برتاؤ تھا۔ اولاد کے ساتھ کیسا رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب میں سوائے خموشی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر انجیلوں میں تربیت اولاد کے لئے کوئی تعلیم موجود بھی ہو تو ناقابل تسلیم ہے اس لئے کہ تعلیم اور عمل دو ایسی لازم و ملزوم چیزیں ہیں کہ ان میں سے ایک کا عدم دوسرے کو کالعدم بنا دیتا ہے وہ تعلیم ناقص ہے جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ ہم تو تعلیم کے ساتھ عمل چاہتے ہیں۔ زبانی طور سے کسی کو کوئی چیز بتا دینا اور ہے اور عمل کر کے

دکھانا اور سبب :: اہل کی زندگی بسر کرنیوالے عیسائیوں کو رسول اسلام رحمت للعالمین کے دروازے پر اپنی جبین نیاز کو جھکا دینا چاہیئے۔ جس نے متعدد اور مختلف عمر کی عورتوں سے شادی کر کے کل بنی آدم کے لئے تعلیم کے ساتھ عملی نمونہ بھی چھوڑا۔ انہوں نے بتایا۔ خیرکم خیرکم لاھلہ۔ تم لوگوں میں اچھا وہی ہے جو اپنے اہل کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا ہے۔ اگر جناب عیسیٰ بھی اسی قسم کی تعلیم دیں۔ تو بے کار اور بے سود سمجھی جائیگی۔ اس لئے کہ عملی طور نہ ثبوت ہیں نہیں صرف علم کیا کر سکتا ہے۔ بات وہ کہنے کے قابل ہے جسے انسان کر کے بھی دکھا دے۔ وہ تعلیم فائدہ مند اور قابل تقلید سمجھی جا سکتی ہے جس کا رہنما یعنی تعلیم دینے والا انسان اپنی قوتوں کی تعدیل کر چکا ہو۔ قرآن معلم بے عمل کی نسبت کہتا ہے۔ ما تقولون ما لا تفعلون. جو تم کرتے نہیں ہو۔ اس کے کہنے کی ضرورت کیا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ اُدھر کہا جائے ادھر کر کے دکھایا جائے۔ العالم من صدق قولہ فعلہ۔ عالم وہ ہے جس کے افعال اقوال کی تصدیق کردیں۔ رسول عربی اکرموا اولادکم کا سبق پڑھاتا ہے۔ اولاد کی عزت کرنیکا درس دیتا ہے۔ تو ساتھ ہی ساتھ جناب سیدہ کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو کر بتا دیتا ہے کہ تعلیم اس کا نام ہے کہ ہر تعلیم کے ساتھ فعل نمونہ موجود ہے۔ عن عائشہ قالت کانت فاطمۃ اذا دخلت علی رسول اللہ قام الیھا فقبلہا و اجلسہا فی مجلسہ مطالب السئول صفحہ ۲ منقول از بخاری مسلم ابوداؤد ترمذی

جناب عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضرت فاطمہؑ بارگاہ رسالت میں تشریف لاتی تھیں تو رسول خدا ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پریشانی ہوئی ہے

کا بوسہ لے کر اپنی جگہ پر بٹھا دیتے تھے۔ جناب عیسیٰؑ اہل و عیال کے بارے میں کوئی قابل عمل تعلیم پیش نہیں کر سکتے۔ یہ کمال تعلیم سرکار دو عالم ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی ہندو مذکورہ منازل میں رامچندر جی کو نمونے کی حیثیت سے دکھانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ انہوں نے لنکا کی جنگ بھی فتح کی۔ وہ اہل و عیال بھی رکھتے تھے اور اکثر حلم اور بردباری سے کام لیا۔ اگرچہ جناب رام کے متعلق جتنی بھی باتیں مشہور ہیں۔ وہ اوراق تاریخ میں کسی اہمیت کے ساتھ درج نہیں بلکہ آجکل کے تعلیم یافتہ و روشن خیال ہندو ان چیزوں کو خیالی فسانے اور مصنوعی داستان سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ باوجود اس کے ایک عقیدت مند ہندو کوشش کرتا ہے کہ وہ رام جی کے مفروضہ واقعات کو واقعیت کے جامے پہنا دے مگر ان باتوں کی وجہ سے رام چندر جی کی مشہور اخلاقی کمزوریاں مٹ نہیں سکتیں۔ ایک مذہبی ریفارمر قومی لیڈر اور راہنمائے ملک کی شان کے شایان نہیں کہ وہ محض ایک دھوبی کی نکتہ چینی کی وجہ سے اپنی پیاری بیوی کو گھر سے نکال دے جس نے بارہ سال تک جنگل کی سختیاں جھیل کر داد وفاداری دی تھی۔ سیتا سی وفادار بیوی اس قابل نہ تھی کہ اسے معمولی سے شبہ پر شہر بدر کر دیا جائے بلکہ رام جی کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اپنے شریک زندگی کے حالات کی جانچ پڑتال کرتے اور اپنے فیصلے کو پوری پوری معلومات حاصل ہونے پر موقوف رکھتے۔ اتنے معمولی شک پر کہ جو نہ خود ان کے دل میں تھا۔ ورنہ ایک طویل عرصہ تک گھر میں کیوں رکھتے۔ نہ عامہ رعایا ہی کو بدظنی تھی ورنہ سیتا جی کے شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے شکوک کو پیش

کر دیتے۔ اس لئے ہمیں فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ اگر جناب رام اہل و عیال والوں کے لئے نمونہ بن جائیں تو روزانہ ہزاروں بیچاری غریب عورتیں گھروں سے اس طرح نکال کر پھینک دی جائیں جس طرح دودھ میں سے مکھی۔ اب ایک نظر رام جی کی شجاعت پر بھی ڈالتے چلئے۔ صرف راون کی خطا پر ساری لنکا کو جلا دینا دامن انسانیت کے لئے ایک بدنما داغ ہے۔ اسے شجاعت نہیں کہتے۔ یہ انتہائی مغلوب الغضبی ہے۔ لنکا کے بے جرم باشندے سوکھی لکڑیوں کی طرح جلتے رہے اور رام جی ان کی فریاد سنکر ٹس سے مس بھی نہ ہوئے۔ بیکس عورتوں۔ بچوں۔ جانوروں کو پھونک دینا کوئی بات بھی نہیں یہ عذر باد ہوگا کہ رعایا بھی راون کے ساتھ تھی اور اس کے جرم کی شریک۔ کیونکہ رعیت مجبوراً اپنے بادشاہ کے اعمال و افعال پر راضی رہتی ہی ہے۔ عام اس سے کہ وہ کتنے ظالمانہ اور جابرانہ کیوں نہ ہوں۔ سلطان کی مرضی کے سامنے اس کی خوشی اور ناخوشی کوئی چیز نہیں۔ آج ہندوستان کے حالات سے ہمارے اتھنڈلال کی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر اگر فرض کر لیا جائے کہ راون کے ساتھ ساتھ رعایا بھی شرارت پر تلی ہوئی تھی تو حملہ آور کا فرض تھا کہ بے خبری میں چھاپہ نہ مارتا۔ اور اپنے حملے کی اطلاع دیکر بے خبر لوگوں کو خبردار کر دیتا کہ تم راون کا ساتھ چھوڑ دو۔ ورنہ اپنی دُم میں ایک لاکھ گز کپڑا لپیٹ کر ساری لنکا کو آتشکدہ بنا دونگا۔ اس پر بھی رعایا راون کا ساتھ دیتی تو شاید کچھ آنسو پونچھ جاتے۔ مگر تاریخ ہم کو ایسی چلینج اور الٹی میٹم کا پتہ نہیں دیتی۔ ہم کو تاریخ اجدھیا کے مطالعہ سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ یک بیک عالم بے خبری میں لنکا کو آگ لگا دی گئی

اور ایک لفس کے لئے لاکھوں جان دار پھونک دیئے گئے۔ مہذب دنیا خود فیصلہ کرے کہ ایسی حالت میں رام جی کسی شجاع اور بہادر قوم کے لئے نمونہ ہو سکتے ہیں نہیں۔ صاحبانِ بصیرت تو اس فتح کو شکست کہیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہندو ستانی مذاہب نے اسلام کی نقل اتارنے کی کوشش کی اور آریوں نے حقیقت کے حصول کے لئے قدم بڑھایا۔ لیکن اصل کے مقابلہ میں نقل کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ یجروید میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اے راجہ تو اپنے دشمنوں کو برباد کر دے اور ان کو ایسے جلا جیسے سوکھی لکڑیوں کو جلایا جاتا ہے۔ اس ظالمانہ تعلیم کا انسانیت سے کہاں تک تعلق ہے۔ بہ آریہ صاحبان خود غور کر لیں۔ اچھا آؤ۔ ہم تم کو ایک ایسا عَلَمِ شجاعت دکھائیں جس نے اپنے بے مثال جوہر شجاعت سے صرف ملک اور ملک والوں ہی کو فتح نہیں کیا۔ بلکہ ان کے دلوں پر اپنی بے مثل شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور بہادری کی مہر لگا دی۔ سورۂ فتح نکالو اور پڑھو۔ انا فتحنا لک فتحاً مبیناً۔ اے رسول ہم نے آپ کو فتح مبین دے دی۔

عرب کی سرکش آبادی میں بدترین بہیمیت کے مالک مکّہ کے رہنے والے تھے۔ جہالت ظلم۔ جور۔ شرارت۔ گویا ان کے اجزائے تخلیقی میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنی جہالتوں سے مکّہ کے فاتح کو ایسی تکلیفیں پہنچائی تھیں جن کی خونچکاں داستان آج تک بغیر رلائے نہیں چھوڑتی۔ مکّہ کا مظلوم فاتح جب فاتحانہ انداز سے مکّہ کی فضا میں اپنی فتح کا جھنڈا لہراتا ہے تو اس کے سامنے وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کو عزیز اور محبوب وطن مکّہ سے نکال

دیا تھا۔ اس کے پرستاروں پر ایسے ظلم ڈھائے کہ آخر تاب ضبط نہ لا کر ہجرت پر مجبور ہوئے۔ کوئی جناب جعفر کی سرداری میں حبشہ گیا۔ اور کسی نے رسالت مآب کی ماتحتی میں مدینہ کی راہ لی۔ مشرکین مکّہ نے اس کے اعوان و انصار کی اولاد عورتوں۔ مال سب کو چھین لیا۔ بہت سے غریبوں کو قتل کر دیا۔ سینکڑوں کو قید کیا ہزاروں کو بے خانماں بنا دیا۔ تپتی ہوئی ریت اور جلتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ کیا فاتح مکّہ کی آنکھوں میں ان مظالم کی بھیانک تصویر نہ تھی جو تیرہ برس کے عرصہ میں متواتر کئے گئے۔ کیا ان کو اپنے انصار اور اعوا کے لٹنے اور قتل ہونے کا صدمہ نہ تھا۔ اور کیا یہ سرکش مشرک اس قابل نہ تھے کہ ان کے گھر کو جلا دیا جاتا۔ اور ان کو ہر طرح کا عذاب دے کر قتل کیا جاتا ان کی عورتیں کنیزی میں رکھی جاتیں۔ کیا اُن کے ظلم و جور۔ اُن کی ستم آرائیاں قابلِ معافی تھیں۔ بیشک اگر رسولؐ دو عالم ان کو سخت سے سخت سزا دیتے۔ ان کا گھر جلاتے۔ ان کا مال و دولت لٹوا دیتے۔ تو مہذب دنیا کو دم مارنے کی جگہ نہ تھی۔ اگر صرف سیتا کے چھن جانے پر لنکا جلائی جا سکتی ہے۔ اگر دشمنوں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح پھونکا جا سکتا ہے۔ اگر معمولی سی نافرمانی پر ہزاروں لوگ گولی کا نشانہ بنائے جا سکتے ہیں۔ تو یقیناً مکّہ کے وحشی صفت خونخوار انسان عبرت تعزیر کے لائق تھے۔ اور یہ سزا کسی فرد انسانی کی نظر میں قبیح نہیں ہو سکتی تھی مگر اے رحمۃ للعالمین اے تمام جہان کے کامل اور مکمل نمونے تو نے انک لعلی خلق عظیم کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا دیا۔ ظالموں کو معافی کا پروانہ دیا۔ مجرموں کو بخش دیا۔ قابلِ قتل لوگوں سے درگذر کی۔ مظلوم فاتح ظالم مفتوح سے

پوچھتا ہے کہ تم مجھ سے کس قسم کے برتاؤ کی امید رکھتے ہو۔ سب نے یکزبان ہو کر کہا کہ بخشش اور عفو کی۔ خلق عظیم کے مالک نے جواب دیا۔ میں نے بخشا۔ میرے خدا نے بخشا۔ لاتثریب علیکم الیوم۔ کیا عالم امکان اس قسم کی بخشش ایسے عفو ایسے کرم ایسے رحم کی مثال پیش کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔

یہ ہے تعلیم قرآنی جزاء سیئة سیئة فمن عفی واصلح فان اللہ غفور الرحیم کا عملی پہلو کہ رسول نے اپنے عمل سے اس آیت کو مکمل کر دیا اور اس کے قابل عمل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر کوئی ایسی فرد کو پیش کر دے جس نے اپنے آپ کو کمزور پا کر ظالم کو معاف کر دیا ہو۔ لیکن یہ معافی جوہر عفو کی چمک کو نہیں پا سکتی۔ قبضہ پا کر ظالم کو معاف کرنا اور لاچاری میں لفظی معافی دینا زمین و آسمان کا فرق رکھتا ہے۔ عفو جیسے عظیم خلق کا اظہار اسی وقت قابل ستائش ہے جب دشمن گرفت میں ہو مظلوم پوری طرح بدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو۔ ورنہ کمزوری اور مجبوری کی حالت میں عفو بے معنی چیز ہے ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

تتمہ کلام

اگر تہذیب و تعدیل قوائے انسانی کا نام مذہب ہے
اور ارباب عقل کے نزدیک حقیقت مذہب ہے بھی

یہی۔ تو بیشک رسول اسلام نے اپنے قول و عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی تعلیم میں ان اصول کو پیش کر رہا ہے جو قوائے انسانی کو اس نقطہ تک

پہنچانے کے ضامن ہیں۔ جہاں نہ افراط کا گذر ہے نہ تفریط کا۔ وہ کسی قوت کو معطل کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ کسی طاقت کو بے لگام رکھنا پسند کرتا ہے بلکہ اس کے نزدیک ہر طرح کی صلاح و رستگاری کا راستہ یہی ہے کہ ہر قوت سے اس کے محل مناسب میں ایک معیّن حد تک کام لیا جائے۔

شہوت و غضب دو ایسی قوتیں ہیں کہ جن کے مفہوم کو بعض مذاہب نے بھیانک اور خونخوار درندوں کی طرح خوفناک ظاہر کیا ہے۔ اس حد تک کہ آج بھی اس کا تصور ہمارے دل و دماغ میں ایک خوف آلود اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ بدھ۔ آریہ عیسائی وغیرہ مذاہب کی تعلیمات کو دیکھئے۔ تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔

مگر رسولِ اسلام نے بتلایا کہ جیسے تم سنکھیا خیال کر رہے ہو۔ درحقیقت وہ تمہارے تمدنی اور معاشرتی امراض کے لئے اکسیر شفا ہے۔ غضب و شہوت جہاں عدمِ تعدیل کی حالت میں حیوانیت و بہیمیت کا سرچشمہ ہیں۔ وہاں عالمِ تہذیب میں عفو و رحم۔ شجاعت۔ عفت۔ سخاوت وغیرہ جلیل اخلاقی جواہر کی کان بھی ہیں۔ تم انکی ظاہری صورت سے نہ ڈرو بلکہ ان کو مسخر کر کے اور اُن سے اُن کا صحیح کام لیکر اپنی انسانیت کی تکمیل کر کے اس منزل تک جا پہنچو۔ جہاں جانے کے لئے تم کو پیدا کیا گیا ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جو رسولِ اسلام کو خاتم الانبیاء ثابت کرتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ عقل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ محمدؐ کے بعد کسی نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس نے انسانی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں چھوڑی جسکی تعدیل کے اصول و قوانین خود عمل پیرا ہو کر نہ بتا دیئے ہوں پھر جب ہر قوت

کی تعدیل و تکمیل کے اسباب تعلیم رسول عربی میں موجود ہیں تو کسی نبی کی حاجت عقل تسلیم کرنیکے لئے کیونکر تیار ہو سکتی ہے۔ دوا تو اس وقت دی جاتی ہے جب انسان بیمار ہو۔ آبیاری کے لئے زراعت میں خشکی کی نمود ضروری ہے۔ مکان کی مرمت کے لئے شکستگی لازمی ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت ہو۔ تو دفع ضرورت کے اسباب کی حاجت ہوگی اور جب کوئی ضرورت ہی نہیں۔ تو پھر سامانِ دفع ضرورت کی کیا ضرورت۔ لہٰذا محمدؐ کے بعد کسی نبی کا تسلیم کرنا درحقیقت عقلا کو مضحکے اور استہزا کا موقع دینا ہے۔ فصدق اللہ حیث قال۔

= ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین =

ومن اصدق من اللہ قیلا۔ یہ ہے وہ حقیقت ثابتہ جو ہر رنگ میں ثابت رہتی ہے بیشک رسول اسلام ہر حیثیت سے خاتم الانبیاء ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد ولی الحسین صاحب قاضی محلہ بدایوں (یو۔پی)

میں لالہ کیشب چندر ہانڈہ بی۔اے مینیجنگ پروپرائٹر ہانڈہ الیکٹرک پریس جالندھر شہر میں چھپا [illegible] سے شائع کیا